Mairaj
VOL 1 ,Issue 1
https://www.mairaj.pk info@mairaj.pk

شبانہ اے بلاری،
کرناٹک یونیورسٹی، دھارواڑ، انڈیا۔
ڈاکٹر محمد یوسف ناکیواڑی،
صدر شعبہ اردو کیٹل آرٹس کالج، دھارواڑ، انڈیا۔

اردو ادب میں اشتراکیت کا زوال اور اس کے اسباب

Shabana A.Ballari
Karnatak University, Dharwad, India.
Dr. Muhammad Yousuf Nakewadi
President of Urdu Cattle Arts College , Dharwar,India.

The Decline Of Communism In Urdu Literature And Its Causes

The term ‘ ‘Communism’’ refers to a social system in which the means of production (land, minerals, factories, banks, trade, etc.) are collectively owned by the community, and their production is distributed according to the creative labor of the mental or physical workers. The most famous concept of Communism was given by Karl Marx and Frederick Eagles. According to them, any socialist society has three basic characteristics; The means of production are jointly owned, all decisions are made democratically,and goods are made for utility rather than profit. The facts and history tell us that a large majority of the people in Russia under the leadership of Lenin overthrew the most oppressive tsarist capitalist government and established a labor democracy and put all the means of production under the democratic control of the workers. An all-out effort was made to meet public needs by maximizing production and utilization. As a result of which this revolution made Russia not only a developed country in a few decades from a most backward country, which was even more backward than today's Pakistan, but also the Soviet Union emerged as the second largest superpower in the world. It happened for the first time in human history, but the concept of such a high and fastest development in the capitalist society is also absent, thanks to which the real freedom of man in the society was provided with solid material foundations, even our enemies acknowledged it. In this article we will discuss the decline of Communism in Urdu Literature and will find its causes.

Keywords: Community, Communism, Democratically, Acknowledged, Literature

وقت کے ساتھ ہر شئے کا جہاں عروج ہوتا ہے وہاں زوال بھی لازمی ہوتا ہے۔ سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کا غروب ہونا ضروری ہے۔ خوشی کے ساتھ مصائب و آلام کا ہونا بھی ضروری ہے۔ موسم بہار کے بعد موسم خزاں کی آمد بھی ضروری ہے۔ اس طرح کوئی تحریک یا کوئی رجحان جب منظر عام پر آتا ہے تو ایک روز اس کا زوال بھی ضرور ہوتا ہے۔ یہ عروج وزوال انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہ خدا کا نظام ہے بھی اور انسان کی تدبیر کا نشیب و فراز بھی

ہے۔اسی طرح اردو ادب میں اب تک کوئی بھی تحریک یا کوئی رجحان ہمیشہ کے لئے نہ قائم ودائم رہا ہے نہ رہے گا۔ ان کی تحریک یا رجحان کے وجود میں آنے کی کئی وجوہات ہوتے ہیں۔ مثلاً سیاسی، معاشی، اقتصادی اور معاشرتی وغیرہ۔ لیکن بنیادی سبب معاشرہ اور ماحول میں تبدیلی ہے۔ معاشرہ اور ماحول میں تبدیلی واندورونی سطح پر بھی ہوسکتی ہے اور بیرونی سطح پر بھی کی ادبی روایت کے بدلنے یا ٹوٹنے کی ایک وجہ یہی ہے کہ وہ زمانے کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ وقت کے بدلنے کے ساتھ معاشرہ اور ماحول کے تقاضے بھی بدل جاتے ہیں۔ پرانی قدر میں ملتی ہیں تو ان کی جگہ نئی ادبی قدر میں جنم لیتی ہیں بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کا ایک تعلیم یافتہ طبقہ جو یورپ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے واقف تھا۔ خاص کر روسی انقلاب کے پیش نظر اس نے چاہا تھا کہ ہندوستانی معاشرے سے استحصالی نظام اور طبقاتی تفریق ختم ہو جائے اس کے لئے اس نے ایک تحریک چلائی جو ترقی پسند تحریک کے نام سے متعارف ہے۔

1857ء کے بعد انگریزوں کی حکومت ہندوستان پر پوری طرح اپنا سکہ جما چکی تھی۔ خاص قسم کا ذہن تیار ہونے لگا تھا۔ کھیل اور تصوف کی جگہ عقل اور منطق نے لے لی۔ تعلیم یافتہ اشخاص مذہبی اصولوں کو بھی اپنی نطقِ عقل کی کسوٹی پر پرکھنے لگے۔

ترقی پسند تحریک کا منشور ہر سیاسی پارٹی کے منشور کی طرح بہت عمدہ تھا۔ اس کی تعریف عبدالحق اور علامہ اقبال نے بھی کی۔ لیکن عمل منشور کے برعکس ہوا۔ کیونکہ ہندوستان کے ترقی پسند ادباء وشعراء نے اپنی تخلیقات میں ہندوستانی ماحول کو پیش کرنے کی بجائے کارل مارکس کے نظریۂ اشتراکیت کو پیش کیا ہے۔ وہ اپنی ادبی تخلیقات میں ہندوستانی زندگی اور اس کے معاشی اور سماجی مسائل کو اتنا بھی پیش نہ کرسکے۔ جتنا ان سے قبل نظیر اکبر آبادی، حالی سرسید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، پریم چند وغیرہ پیش کر چکے تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ترقی پسند تحریک کے جتنے بھی کارپرداز تھے وہ ہندوستان کی بجائے روس کی طرف دیکھ رہے تھے تاکہ شہرت حاصل ہو اور انعامات سے نوازے جائیں۔

اشتراکیت مذہب، تصوف، روحانیت، ماورائیت، محبت اور تخلیقی فن کے خلاف تھی۔ ترقی پسندوں میں تقریباً سبھی اشتراکی نظریہ کے حامی تھے اور اشتراکی نظریہ کی بنیاد ہی خدا کے انکار پر رکھی گئی تھی اور کارل مارکس نے مذہب کو افیون سے تعبیر کرکے اس کی اہمیت کو ختم کر دیا۔ کارل مارکس نے اشتراکیت کی بنیاد غیر مذہبی مادیت پر رکھی جسے روسی تہذیب میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ روسی تہذیب جسم کے مطالبات، مادیات اور محسوسات کے علاوہ کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتی تھی۔ یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے بعد معقولیت کے علمبردار تھامس ہابس (1677 - 1588) اور ڈیکارٹ (1556-1652) نے روحانی اور مذہبی اقدار کو ناقابل اعتناء سمجھا۔ مادہ کو حقیقت جان کر خدا کے وجود سے انکار کیا۔ غرض اشتراکیت بنا خدا کا مذہب (Godless-Religion) نہیں بلکہ اشتراکیت کا خدا مارکس کو مان لیا گیا۔ داس کیپٹل Das Capital اس کی بائبل ہے۔ لین اور اسٹالن اس کے پیغمبر ہیں اور زیارت گاہ ماسکو ہے۔ دراصل اشتراکیت ہی نشہ ثابت ہوئی۔ ہر پڑھا لکھا ہر پروفیسر، شاعر، ادیب، ناقد بغیر سوچے سمجھے اشتراکی افیون پی کر مست ہو گیا۔ خدا سے انکار کر بیٹھا اور اخلاق کو بالائے طاق رکھ دیا۔ چونکہ بغاوت کا تعلق مارکس کی اشتراکیت سے ہے۔ اس لئے سردار جعفری بغاوت ہی کو مذہب اور خدا کہنے لگے

دراصل دوسری جنگ عظیم کے دوران فاشزم کا مقابلہ کرنے کے لئے ساری دنیا میں وجورائے عامہ کی تھی اور عوامی بیداری کی جو اہر کی تھی۔ اسی سوچ کا نتیجہ یہ تحریک بھی تھی اور اس کا مقصد دنیا میں امن کی بحالی تھا۔ جس کے لئے وہ اشتراکی نظام حیات کو واحد ذریعہ سمجھتی تھی۔ چونکہ اشتراکیت ادب کو عوامی و ترسیل کا ایک طاقتور ذریعہ تسلیم کرتی ہے اور ادب میں جانبداری کو جائز ہی نہیں لازمی قرار دیتی، اس لئے اشتراکی دانشوروں نے ساری دنیا کے ادب کو سب سے پہلے اپنی دسترس میں نے آنے کی کوشش کی۔ ترقی پسند تحریک کے بانی وہ ہندوستانی طالب علم جو اس وقت لندن میں زیر تعلیم تھے۔ ااان کے سامنے ایک غلام ملک ہندوستان کی حالت زار تھی اور انہوں نے محسوس کیا کہ اشتراکیت کا عمل نہ صرف ہندوستان کی حصول آزادی کی تحریک میں نئی جان ڈال سکتا ہے بلکہ ایک پرامن معاشرے کی تعمیر میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے انہوں نے ادب کے توسط سے ہی اس تحریک کا آغاز کیا۔ روس کا کامیاب انقلاب جس کی طرف لوگ حیرت وحسرت سے دیکھ رہے تھے ان کے لئے ایک مثال تھا۔ انقلاب کا میلان نوجوانوں کو کارل مارکس کے فلسفے کے قریب کھینچ لایا تھا۔ جس کو وہ ایک عقیدے کے طور پر قبول کر چکے تھے اور اشتراکی اصول وعقائد کو ادب میں پیش کرنے کا بیڑا اٹھا چکے تھے۔ اور ادب کو اشتراکی نقطہ نظر سے دیکھنے کے

قائل تھے۔ ان کی نظر میں وہی شخص، وہی شاعر، وہی ادیب معتبر تھا جو کمیونسٹ ہو۔ یہاں تک کہ اس تحریک نے زور پکڑا کہ جو کمیونسٹ نظریات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے انہیں نہایت توہین آمیز طریقے سے انجمن سے نکالنا شروع کر دیا تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تاج پیامی لکھتے ہیں:

"جن لوگوں نے اشتراکیت اختیار کرنے سے انکار کیا ان کے گھروں کو بلڈوزر لگا کر مسمار کر دیا گیا۔ مذہب پر پابندی لگا دی گئی۔ گرجے اور مساجد پر تالے لگا دئے گئے۔ شخصی آزادی ختم کر دی گئی۔ تحریر اور تقریر کا دائرہ اشتراکیت کی تشہیر تک محدود کر دیا گیا۔ اخلاق کے ساتھ ہی انسانی جذبات کو مجروح کر دیا گیا۔ الغرض انسان ایک مشین کا پرزہ بن کر رہ گیا۔ اور آزادی صرف زنجیر کی لمبائی تک محدوڑی۔ اشتراکیوں نے خدا سے انکار کیا، جنت اور دوزخ سے انکار کیا۔ ان کے نزدیک سزا اور جزا کا کوئی تصور نہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محبت و مروت، دوستی، رواداری، ایثار و قربانی جیسی اعلیٰ اخلاقی قدروں سے انسان محروم کر دیا گیا۔ بعض روسی اشتراکیوں کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ جذبات و احساسات سے عاری لوگ مشین کا ایک پرزہ ہیں۔ نہ وہ کسی سے محبت کرتے ہیں اور نہ ان سے کوئی محبت کرتا ہے۔ ایک کمیونسٹ روسی شاعر "مایاکووسکی" کو کہنا پڑا ہمارا سیارہ محبت کے لئے مناسب اور موزوں نہیں 'چنانچہ ترقی پسند تحریک میں کمیونسٹ کی جو حمایت کی جارہی تھی ان کے کچھ اصول تھے جس کے ماتحت وہ کام کرتے تھے۔ اشتراکی ادب جو رجحان کے طور پر اردو ادب پر وارد ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ : ہندوستان کے عوام کو تاریک عقائد اور توہمات سے دور کر کے ان میں ذہنی پستی کے بجائے بیداری لائی جائے۔ لیکن یہاں ان سے ایک غلطی ہوئی وہ یہ کہ روس اور ہندوستان کے تہذیبی، مذہبی، سماجی اور سیاسی حالات میں بڑا فرق تھا۔ ہندوستان کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ باہر سے آنے والوں نے اس ملک پر حکومت کی ہے۔ سیاسی طور پر یہاں کئی انقلاب آئے لیکن وہ یہاں کے عوام کے مذہب اور بنیادی عقائد پر حملہ کرنے کی بھی جرات نہ کر سکے۔ اس لئے کہ یہاں مذہبی پہلو اس قدر کم رہا ہے کہ اس کے خلاف کسی منظم انقلاب کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔"(1)

تمام اشتراکی خیالات و نظریات رکھنے والے ادباء شعراء نے اپنے جوش و خروش میں یہ بنیادی نکتہ فراموش کر بیٹھے کہ اس ملک میں مذہب کی جڑیں کتنی گہری ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے اشتراکی عقائد کے زیر اثر ہندوستان مذاہب اور ہندوستانیوں کے عقائد پر وار کر بیٹھے جس کا شدید ردِ عمل ہوا۔ حصول آزادی کی جدوجہد و کے دور میں ردِ عمل کی آواز زیادہ ابھر کر سامنے نہ آسکی اس لئے کہ اس وقت غلام ہندوستان کو آزادی سے ہمکنار کرنا اولین مقصد تھا۔ لیکن جیسے ہی ہندوستان نے آزادی کے بعد بھی مذہب کے معاملے میں مخالفانہ طرز فکر پر شدید ردِ عمل شروع ہو گیا۔ جس سے اشتراکی رجحان کی ساکھ پر منفی اثرات مرتب ہونا شروع ہوئے اور اس طوفان نے اس طاقتور تحریک کی دھجیاں اڑادیں۔ اردو ادباء شعراء نے اشتراکیت کو روشن خیال کی علامت کی حیثیت سے پیش کیا اور مذہب سے وابستگی کو قدامت پرستی کا متبادل بنادیا اور اس انتہا پسندانہ روی کی تبلیغ و اشاعت کے لئے نہ صرف خود ادب کا آزادانہ استعمال کیا بلکہ تمام لوگوں کو ایسا کرنے کے لئے اکسایا۔ ان کے نزدیک مذہب باطل ہے اور اس کی حیثیت افیون کی ہے۔ معاش انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اور معاشی مساوات کے لئے انقلاب برپا کرنا ضروری ہے۔ پرانی روایتوں اور قدروں اور تہذیبی رسموں رواجوں اور قاعدوں کا توڑنا ضروری ہے۔ مذہب کی اساس پر تفریق باطل ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا مذہب انسانیت کا ہے۔ ادیب کا کام انسانیت کی خدمت کرنا ہے۔" مذہب ہندوستان کی طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی ملک میں جتنے بڑے بڑے انقلاب رونما ہوئے ان سب میں مذہب کا جذبہ کار فرما تھا۔ ہمارے ملک میں ایسی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی جس کے پس پشت مذہب دشمن رجحانات کار فرما ہوں۔ ترقی پسند تریک اپنی نظریاتی اساس کے خلاف مذہب کی حمایت نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ اشتراکیت بجائے خود ایک عقیدہ ہے

اردو ادیبوں پر اشتراکیت کے عقیدے کے ساتھ ان میں غیر شعوری طور پر ان کے اقوال اور اعمال فکر اور عمل کا تضاد بھی شامل رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہندوستانی عوام کے مزاج کے مطابق اپنے نظریات میں تبدیلی لانے کے لئے کسی طرح بھی تیار نہیں تھے۔ ان نوجوانوں نے ظاہری کامیابیوں کے جوش میں ان بنیادی وباتوں کو فراموش کر دیا جن کے بغیر سی بھی سماج کی تعمیر نو کا خواب شرمندہ تعبیر ہو ہی نہیں سکتا۔ لہذا اشتراکیت کے اس خیالات و نظریات کی شدت نے ادب کو زوال کی طرف گامزن کیا۔ اشتراکیت کا زور جبر و تشدد پر تھا۔ اشتراکی نظام نے ذاتی ملکیت کو مشترکہ ملکیت قرار دینے کے لیے خون خرابے سے کام لیا۔ ذاتی ملکیت کو اجتماعی ملکیت بنادینا کوئی کھیل نہ تھا۔ یہ ایک بڑا ہی سخت کام تھا جو برسوں تک مسلسل نہایت ہولناک ظلم و ستم کرنے سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس

اسکیم کو عمل میں لانے کے لئے تقریباً 19 لاکھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ 40 لاکھ آدمیوں کو مختلف قسم کی سخت اذیتیں دی گئیں۔ اور 50-40 لاکھ آدمیوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ صرف ایک اجتماعی زراعت کی اسکیم نافذ کرنے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں مالی و جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کی زد میں بے گناہ کا خون بہایا گیا۔ اشتراکی لیڈروں نے اس انقلاب کو عمل میں لانے کے لئے خدا اور مذہب کے خلاف سخت پروپیگنڈہ کیا اور بورژوا طبقے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذہبی طبقوں کو بھی بڑی بے دردی سے کچلا اور اخلاق کا ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ جو لینن کے الفاظ میں ہے۔:

"ہم ہر اس اخلاق کو رد کرتے ہیں جو عالم بالا کے کس تصور پر مبنی ہو یا ایسے خیالات سے ماخوذ ہو، جو طبقاتی تصورات سے ماوراء ہیں۔ ہمارے نزدیک اخلاق قطعی طور پر طبقاتی جنگ کا تابع ہے۔ ہر وہ چیز اخلاقی طور پر بالکل جائز ہے، جو پرانے نفع اندوز اجتماعی نظام کو مٹانے کے لئے محنت کش طبقوں کو متحد کرنے کے لئے ضروری ہو۔ ہمارا اخلاق بس یہ ہے کہ ہم خوب منضبط اور منظم ہوں، اور نفع گیر طبقوں کے خلاف پورے شعور کے ساتھ جنگ کریں۔ ہم یہ مانتے ہی نہیں کہ اخلاق کے کچھ ازلی و ابدی اصول بھی ہیں، ہم اس فریب کا پردہ پاک کر کے رہیں گے، اشتراکی اخلاق اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مزدوروں کے مطلق العنان حکومت مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کے لئے جنگ کی جائے" ۔(2)

یہ ایک زبردست قیمت تھی جو سرزمین روس کو اشتراکی نظام کے لئے دینا پڑی۔ لیکن صرف ایک کروڑ آدمیوں کی زندگی ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ دین ، ایمان، اخلاق، انسانیت، شرافت وغیرہ کو مسمار کر کے اشتراکی لیڈروں نے اشتراکی نظام کو نافذ کر دیا تھا۔ جس کے اثرات ترقی پسند تحریک پر بھی بہت گہرے پڑے ۔ اردو ادب کے ادبا اور شعرا عملی لحاظ سے نہ سہی لیکن نظریاتی اعتبار سے اشتراکیت کے ہمنوا تھے۔ جس کی وجہ سے ترقی پسند ادبی تحریک کی مخالفت بھی ہوئی ۔ ان ادباء و شعراء پر بالعموم ادب برائے ادب کے پروپیگنڈے کا الزام لگایا گیا۔ جس میں جزوی صداقت ہے۔ جس طرح کلاسیکل غزل نے مخصوص موضوعات کی بنا پر تکرار سے ایک بنے بنائے سانچے کی صورت اختیار کر لی اسی طرح بعض ادباء و شعراء نے بھی مزدور، کسان، سرمایہ دار، زمیندار، انقلاب، بغاوت اور سرخ سویرا کے فارمولوں کی طرح استعمال کیا اور بعض جوش و خروش، جذباتیت یا شعور کی بنا پر محض نعرہ بازی سے معنی خیزی پر تل گئے۔ اشتراکیت کے زوال میں انگارے کے افسانوں کے مجموعے کا ذکر ناگزیر ہو گا۔ اس مجموعے میں بھاری خیالات و نظریات کو پیش کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں بھی فحش نگاری پر کافی زور دیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی کافی مذمت ہوئی اور مخالفت بھی۔

"ان کہانیوں میں انقلابی اور باغیانہ خیالات کے ساتھ ادب کی نئی ادبی جہات کی تلاش بھی شامل تھی۔ تاکہ نئے سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی کو ممکن بنایا جا سکے۔ ان نوجوان مصنفین میں حالانکہ جوانی کے جوش و خروش کی افراط اور دانشمندانہ اعتدال و توازن کی کمی تھی۔ پھر بھی انہوں نے مروجہ اخلاقیات اور مذہبی عقائد پر کھل کر وار کئے تھے۔"(3)

دراصل یہی زاویہ فکر اس زمانے کے طلباء میں عام تھا اور انگارے مجموعے نے کسی حد تک اس کی ترجمانی کی تھی۔ اس کتاب کی مخالفت صرف حکومت نے ہی نہیں کی بلکہ پرانے خیالات رکھنے والے ان لوگوں نے بھی کی جو اس طرح کی حرکتوں کو خلافِ تہذیب اور بے راہ روی تصور کرتے تھے۔ انہوں نے باقاعدہ طور پر اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا اور حکومت سے اس کتاب کو ضبط کر لینے کا مطالبہ پیش کیا۔ تقریباً سارے رسائل و جرائد اور چھوٹے بڑے تمام روزناموں نے اس مجموعے کی مذمت میں اداریے لکھے اور مضامین شائع کئے۔ اس طرح اس کتاب پر فتوے صادر ہوئے اور انگارے کے مجموعے کو ضبط کر لیا گیا جو اشتراکی خیالات و نظریات کا اردو ادب پر یہ پہلا باقاعدہ حملہ تھا جس میں حکومت کے ساتھ روایت پرست عوام بھی شامل تھے۔ اور ادب پر یہ پہلا باقاعدہ ردِ عمل گویا اشتراکی زوال کی نشانی تھی۔

گوپال متل نے بھی اس اشتراکی رجحان کے زوال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ گوپال متل نے 1956ء میں انگریزی میں ایک کتاب "The Mench of a Conspirancy" تھی جس کا اردو ترجمہ ادب میں ترقی پسندی ایک تحریک یا سازش "کے نام سے دو سال بعد 1958ء میں شائع ہوا۔ انہوں نے اس کتاب میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تحریک یا رجحان دراصل ایک سازش تھی۔ جس کا مقصد دراصل برصغیر ہندو پاک میں کمیونسٹوں کی بالادستی کا قیام تھا۔

اس رجحان کو پیش کرنے والے ادبا اور شعراء میں انتشار بھی پیدا ہو گیا تھا۔ ان میں سے بیشتر ایسے تھے جو جذباتی سطح پر اس رجحان اور روسی کمیونزم کو اپنی زندگی کا حصہ سمجھ چکے تھے۔ جس کی وجہ سے اشتراکیت کا شیرازہ بکھرتا ہوا نظر آیا۔ چونکہ اشتراکی ادیبوں نے ادب کو پروپیگنڈہ بنادیا۔ ادب کو انہوں نے چند زنجیروں میں باندھ دیا۔ ادیبوں کے قلم کی آزادی چھین لی گئی ۔ اور ایک محدود دائرے میں رہ کر لکھنا ان کا مقصد اور شعر اور ادب میں صرف کمیونسٹ خیالات و نظریات کو پیش کرنا ان لوگوں کا منشور تھا۔ ترقی پسندوں نے اپنی تعلیمات میں مذہبی اجارہ داری وجاگیر داری، سرمایہ داری کے ساتھ ہی مزدور کے استحصال جیسے الفاظ خوب استعمال کئے۔ اس سے ان کو کئی فائدے حاصل ہوئے۔ انہیں کمیونسٹ پارٹی اور کمیونسٹ ممالک کی حمایت حاصل رہی۔ ان کی معمولی ادبی شعری تخلیقات کو کمیونسٹ پروپیگنڈے کے ذریعے شہرت بھی خوب ملی اور انہیں مالی منفعت بھی حاصل ہوئی۔ بڑے بڑے انعامات ملے اور وہ عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن ان سے ہندوستان کے غریب عوام کا کچھ بھی بھلا نہیں ہوا کیونکہ یہ لوگ اپنے مقصد میں مخلص نہیں تھے۔ انقلاب روس کا تمام اقوام مشرق پر گہرا اثر پڑا۔ دنیا کی پہلی مزدوروں اور کسانوں کی حکومت کے قیام، سرمایہ داری اور جاگیری نظام کے خاتمے اور روسی سلطنت میں محکوم ایشیائی اقوام کی آزادی نے مشرقی قوموں کی آزادی کی تحریکوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا کیا۔ ایک نیا انقلابی فلسفہ، انقلابی طریقہ کار مثالی حیثیت سے ہمارے سامنے آیا۔ ساتھ ہی ساتھ روس کی نئی حکومت نے براہ راست اور بالواسطہ مشرق کی ان قوموں کی مدد کرنا شروع کی جو سامراجی محکومی سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہی تھیں۔

چنانچہ ترکی، ایران، افغانستان نے سوویت حکومت کی پشت پناہی حاصل کر کے سامراجی جوے کو اتار پھینکا۔ کمال اتاترک، رضا شاہ پہلوی، شاہ امان اللہ، چین کے قومی رہنما سن یات سین روسی انقلاب کے عظیم رہنما لینن سے ذاتی تعلقات رکھتے تھے۔ اقوام مشرق کے ان آزادی خواہ رہنماؤں کو احساس تھا کہ دنیا میں ایک ایسی طاقت وجود میں آگئی ہے جو نہ صرف یہ کہ سامراجی نہیں ہے بلکہ عالمی پیمانے پر سامراج کی مخالفت اور محکوم اقوام کی آزادی کی طرف دار اور حمایتی ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، پہلی عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد سے یہاں پر زبردست آزادی کی لہر اٹھی تھی۔ نان کو آپریشن اور خلافت کی تحریکوں میں لاکھوں میں ہندوستانیوں نے شریک ہو کر برطانوی سامراج کو چیلنج کیا تھا۔ اشتراکی ادیبوں نے رومانیت کو پس پشت ڈال کر زیادہ تر انقلاب ہی کو پیش پیش رکھا جب کہ ادب کا عروج بغیر رومانیت کے ناممکن تھا۔ اشتراکی ادیبوں نے صرف انقلاب، بغاوت اور جبر و تشدد کو اہمیت دی۔ جس کی وجہ سے اشتراکی رجحان میں کمی آنے لگی۔ اشتراکی ادب پر سیاسی حملہ تقریباً 1936ء میں انجمن کی پہلی کل ہند کانفرنس کے فوراً بعد ہوا۔ یہ حملہ کلکتہ کے " اسٹیٹس مین " (Statesmen) نے کیا۔ اس اخبار میں اشتراکی خیالات کی مخالفت میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا۔ جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہ کمیونسٹوں کی چلائی ہوئی ایک سیاسی تحریک ہے۔ تحریک سے متعلق نوجوانوں کو اس اخبار نے سویت یونین کا ایجنٹ قرار دیا۔ اور ان پر اپنی سرگرمیوں میں کمیونسٹ انٹرنیشل (International) کے احکامات کے تابع ہونے کا الزام لگایا۔ کمیونسٹ پارٹی کے ٹوٹنے سے اشتراکی رویوں کی عقیدت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ جس سے متاثر ہو کر کیفی نقی نے نظم آوارہ سجدے لکھی جو 1962ء میں کمیونسٹ اکائی کے ٹوٹنے کی ایک جھلک تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کے انتشار کے تعلق پروفیسر ڈاکٹر عافیہ سلطان لکھتی ہیں :

ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی میں نظریاتی اختلافات کی وجہ سے پھوٹ پڑ گئی اور وہ مختلف جماعتوں میں منقسم ہو گئی۔ ہندوستان سے ہٹ کر اور ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیوں میں بھی پہلا سا نظریاتی اتحاد باقی نہیں رہا۔ روس اور چین دونوں بھی اگر چہ مارکس لینن کے نام لیوا ہیں لیکن دونوں کے نظریوں میں بڑا بعد پیدا ہو گیا ہے۔"(4)

اشتراکی تحریک اصل میں مارکسی نظریہ کو پھیلانے کی تحریک ہے۔ اس کانفرنس کے بعد بہت سے لوگ اس سے الگ ہو گئے۔ مشاہدہ تو کہتا ہے کہ مارکسی نظریہ میں بھی متحد محاذ قائم نہ رہ سکا۔ مارکس کی اشتراکیت کو ماننے کے باوجود چین میں ماؤنواز پارٹی کو اہمیت حاصل ہے۔ خود ہندوستان میں C.P.M اور .1.C.P کمیونسٹوں کی دو الگ الگ پارٹیاں ہیں۔ ایک تیسری پارٹی نے بھی جنم لیا ہے جیسے .P.F.1 کہتے ہیں۔ یہ بھی مارکس کے نظریہ کی حامی ہیں۔ آزادی کے بعد

ایک نیادور شروع ہوااور چھٹی دہائی کے شروع ہوتے ہوتے ہمارے سماج میں کافی تبدیلیاں آئیں۔ کیمونسٹ پارٹی کو بھی ایک ایرانی دور سے گزرناپڑااور آخرکار 1964ء میں اس کے بھی دو ٹکڑے ہوگئے۔ ہمارے اشتراکی ادیب اور شعراء بھی اپنے دور سے گزر کر نئے تجربوں سے دوچار ہوئے اور ان کے شعور میں نئی بالیدگی پیدا ہوئی۔ ادھر صنعتی ترقی نے نئے شہروں کی اہمیت میں اضافہ کیا اور ہم فیوڈل ماحول سے نکل کر صنعتی اور شہری کچھ کے دور میں داخل ہوئے۔ اس عمل میں پرانے رشتے ٹوٹتے بکھرتے گئے اور سرمایہ دارانہ ان کے نئے رشتے ابھرنے لگے۔ ان نے رشتوں میں پرانی تہذیب کی زمین نہیں تھیں۔ اور سارازور ارکس کے الفاظ میں 'cash nexus' پر تھا۔

ہم اب تک نیم جاگیر دارانہ ماحول میں اور اس کی پیدا کردہ قدروں کے دلدادہ تھے اور صنعتی اور تجارتی سانچ کوئی ی قدروں اور صنعتی شہروں کی انسان کش تیز رفتار زندگی سے بالکل آشنانہ تھے۔ اس نے ماحول نے ادبی تقاضوں کو بھی بڑا متاثر کیا اور اشتراکی ادب کی مقبولیت ان نے حالات میں کم ہوتی چلی گئی۔ اس وجہ سے اشترا کی رجحان میں وہ شدت باقی نہیں رہی جو آزادی سے پہلے پائی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں عوام میں کیمونسٹوں کا خیال دین سے دور ہوتا گیا۔ کیمونسٹوں کی جبر و تشدد کی پالیسی سے عوام کو بڑی اذیتیں برداشت کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ 1950ء میں کلکتہ میں بسوں کو جلایا گیا۔ ہر طرف بمباری کی گئی۔ گویا یہ سب ان کیمونسٹوں کی سرگرمیوں میں شامل تھا۔ آزادی کے بعد کیمونسٹ پالیسی پر پابندی لگادی گئی۔ اسطرح یہ پارٹی مزید کمزور ہوتی گئی جس کا اثر کیمونزم کی پالیسی پر پڑا۔ اشتراکی خیالات و نظریات کا اثر ترقی پسند تحریک پر بڑا گہرا پڑا۔ ترقی پسند تحریک پر جب اقتصادیات، سیاسیات کے ساتھ جنسیات جگہ پانے لگے تو ترقی پسند تحریک کے ساتھ اشتراکیت کا زوال بھی لازمی ہوگیا۔ سیاست کے لئے کیمونسٹ پارٹی تھی جسے روس اور چین کی حمایت حاصل تھی۔ ہمارے یہاں کے کچھ ادباءو شعراء فرائڈ کی جنسیات اور نفسیات سے بھی متاثر تھے۔ ن۔م۔راشد اور میراجی اپنی شاعری میں جنسیات کو پیش کررہے تھے۔ افسانے اور ناول میں جنسیات کو پیش کرنے والوں میں منٹو، عزیز احمد، ممتاز مفتی، :عصمت چغتائی معروف ہیں۔ منٹو کے یہاں نفسیات کے مقابلے میں جنسیات کا غلبہ پایا جاتا ہے۔

اشتراکی تحریک کا سب سے نمایاں منفی پہلو یہ رہا ہے کہ اس نے انسان اور جانور میں کوئی امتیاز نہیں سمجھا۔ جس طرح ایک ماہر نفسیات ہر آدمی کو ایک نفسیاتی مریض سمجھتا ہے۔ اسی طرح اشتراکی نظام کی حمایت کرنے والوں نے صرف " روٹی 'کو ہی زندگی کا ایک اہم مسئلہ نہیں گردانا تھا بلکہ ان کی نظر میں انسان وہ جانور ہیں جو جنس اور بھوک کی تسکین چاہتے ہیں۔ اس کے کے بعد بے فکر ہو کر غفلت کی چادر تان لی۔ لیکن وہ کچھ اور بھی چاہتا ہے۔ اگر نہیں چاہتا تو آج ہم غالب کے کلام، تاج محل اور شکسپیر کے ڈراموں سے محروم رہ جاتے۔ لیکن اشتراکی ادیبوں نے انسان کے اور مسائل سے زیادہ روٹی کو اہمیت دی۔ ان کے نزدیک روٹی کمانے اور روٹی کھانے سے بڑھ کر کوئی دوسرا نصب العین نہیں تھا۔ مجنوں گورکھپوری کو آخری کار کہنا پڑا۔

"مارکس کے نظریہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم کو ہوشیار رہنا چاہئے۔ وہ اس وقت پیدا ہوا جب کہ جرمنی میں (Transcendentalism) بری طرح چھار ہی تھی۔ زندگی کے اقتصادی پہلو پر مارکس نے جو زور دیا ہے وہ ایک خالص عصری چیز ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ادب اقتصادیات کی غلامانہ پیروی کرتارہا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اقتصادیات کل زندگی نہیں لیکن بلکہ اس کا صرف ایک عنصر ہے جو کسی دوسرے عنصر پر غالب نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ ہے کہ بغیر روٹی کے کوئی زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن پھر وہ صدیوں پرانی مثل بھی آج تک بدستور ہے کہ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہ سکتا۔"(5)

الغرض اس تحریک سے روٹی کا مسئلہ تو حل نہیں ہوا۔ لیکن اخلاقی اور روحانی قدروں سے دوری ضرور نصیب ہوئی۔ اس نظریے نے صرف روٹی کو ہی زندگی کا منشور قرار دیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فوزیہ یامین لکھتی ہیں۔ اشتراکی فلسفہ کی شیٹ مادہ پرستی وافادیت پرستی سے بیزاری پیدا ہونے گی۔ اس نظریہ نے روٹی کو زندگی کا محور قرار دیا۔ اور مذہب تہذیب واخلاق سب پر حقارت سے نظر ڈالی ؟ اشتراکی تحریک نے روشن مستقبل کا سنہری خواب تو ضرور دکھلایا۔ لیکن روشن حیات پر روشنی نہیں ڈالی۔ اشتراکی مادہ پرستوں نے خدا کی وحدانیت سے انکار کیا۔ جنت اور دوزخ سے انکار کیا۔ ان کے نزدیک اس کی سزا اور جزا کا کوئی تصور نہیں تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محبت و مروت، ایثار و قربانی، دوستی ور واداری جیسی اعلیٰ اخلاقی قدوروں سے ہم محروم کر دیئے گئے۔ اشتراکی تحریک دراصل تحریک نہیں تھی بلکہ تنگ دل اور تنگ نظر اور جبر و تشدد پر مبنی ایک پالیسی تھی۔ اسی بنا پر اردو ادب میں اشتراکیت کا زوال ہوا۔

حوالہ جات

1۔ تاج پیامی، ڈاکٹر: شعورِ تنقید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، انڈیا، 2004ء، ص:23۔

2۔ یعقوب یاور، ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ، 1997ء، ص:132۔

3۔ تاج پیامی، ڈاکٹر: شعورِ تنقید، ص:81۔

4۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، سرمایہ داری اور اشتراکیت، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، انڈیا، 1986ء، ص:59 ۔

5۔ تاج پیامی، ڈاکٹر: شعورِ تنقید، ص:106۔